اکیسویں صدی کے چیلنجز اور اُردو زبان وادب:

امکانات ومباحث

ڈاکٹر ہارون قادر

Dr. Haroon Qadir

Professor, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

ڈاکٹر گلشن طارق

Dr. Gulshan Tariq

Dean of Languages,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

In the 21st century, our world has turned into a global village. Without a language, people from different nations cannot connect to each other. Though English has hegemony in international sphere, we have to maintain the spirit of our national language Urdu and its a need of the hour to modernise it to the international standards. The challenges to Urdu in the current scenario are analysed in this article. Further the work is done to promote it to international parameters in the changing times is discussed as well.

زمانی اعتبار سے بیسویں صدی ایک تاریخ ساز موڑ ہے۔ جہاں سے ہم ایک نئی ہزارویں میں داخل ہوئے ہیں۔اس صدی نے جہاں ہمیں سائنسی ترقی کی طلسمِ ہوش رُبا میں گم کیا وہیں نئی ہزارویں کی پہلی صدی یعنی اکیسویں صدی کے لیے نئے چیلنجز کا انبار ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔

انسانی طرزِ سوچ سے طرزِ معاشرت تک ہر پہلو میں نئے انداز ہمارے سامنے آئے۔مٹی کے گھڑے سے فریج کے یخ بستہ پانی کا سفر ایک دن کا نہیں، کوئی نصف صدی کا قصہ ہے۔اس سوچ اور طرزِ معاشرت کی ترقی ہمارے جذبات، انداز اور رویوں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ہم نے فریج کا ٹھنڈا پانی ہی نہیں پیا، اُس کی ٹھنڈک نے ہم پر طبقاتی اونچ نیچ کا در بھی وا کیا ہے کہ فریج معاشی طور پر نسبتاً مضبوط آدمی یا امیر آدمی کی دسترس میں ہے۔ہم نے کنویں کے پانی سے مٹی کے گھڑے تک جو ترقی کی

اُس میں سرد مہری بہت نہ تھی مگر اب بات بہت آگے نکل چکی ہے کہ الفاظ، اوزار اور ہتھیار کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ اپنے بنانے والے کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ہماری زبان کے بارے میں بھی ہے۔ ہم اپنی سوچ بچار کو الفاظ کا روپ دینے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان کے محتاج ہیں۔ دنیا کی ہر زبان بھلے قدیم ہو یا کم عمر، اس کو زندہ رہنے کے لیے بول چال اور جذبات کے اظہار کے سلیقے کی ضرورت ہے۔ بول چال کے علاوہ لکھنا اشد ضرورت ہے کیوں کہ انسانی تاریخ سے قلم کو اگر نکال دیا جائے تو ہم دورِ حجری میں جا پہنچتے ہیں۔ تمام انسانی ترقی قلم یعنی لکھنے کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی سورۃ القلم میں اس کی اہمیت بیان کی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبان صرف لکھنے سے زندہ رہتی ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے کیوں کہ بول چال کے بعد لکھنے کا عمل ہے۔ پڑھنا اور لکھنا ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں جو صرف بول سکتا ہے وہ اظہار تو کر سکتا ہے مگر صرف اپنی ذات کی حد تک جب کہ لکھا ہوا لفظ پس از مرگ بھی اُس کو زندہ رکھتا ہے۔(۱)

آج کا دور سائنسی اور خلائی ترقی کا دور ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد مفید ترین ایجاد ہے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمپیوٹر کے بعد لکھائی کی اہمیت نہیں۔ جناب کمپیوٹر قلم کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے جہاں تختی کی بجائے کاغذ اور کی بورڈ آپ کی قلم کا کام کرتا ہے۔ اس میں بھی جدید روشنائی استعمال ہوتی ہے اور کاغذ پرنٹ ہو کر آپ کے سامنے آتا ہے۔ آپ ہجے درست لکھیں گے تو لکھائی درست ہوگی۔ ہاں اس ایجاد نے ہماری خوشخطی کے ہنر کو پامال ضرور کیا ہے۔ اب خوش نویسی کا ہنر گئے وقتوں کی بات ہے۔ اصل مسئلہ الفاظ اور نئی ایجادات کے لیے مخصوص الفاظ کا ہے کیوں کہ ہر بامعنی لفظ دراصل کسی فعل کا نام ہے مثلاً ہم کاغذ پر قلم سے اپنے خیالات کو درج کرتے ہیں اس فعل کا نام ''لکھنا'' ہے۔ غرض یہ کہ ہر لفظ کسی خاص موضوع یا فعل کے لیے بنایا گیا ہے۔

یہیں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کیا اکیسویں صدی میں جس ترقی کی توقع ہے اور بدلتے ہوئے حالات اور واقعات جس صورتِ حال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کیا اُردو زبان اُس کا ساتھ دے سکے گی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ جو زبانیں یا معاشرت نئے حالات کے تقاضوں میں نہ ڈھل سکیں وہ قصہ پارینہ بن جاتی ہیں۔(۲) آج عبرانی زبان بولنے والے کتنے ہیں؟ لاطینی اور یونانی زبانیں کسی زمانے میں اقتدار کی مسند پر تھیں مگر آج چند علاقوں تک محدود ہیں۔ دور کی بات نہیں فارسی پورے برصغیر میں اقتدار کی زبان تھی مگر آج بطور مضمون صرف کالجز میں پڑھائی جاتی ہے اور وہ بھی محدود حد تک۔

آج کا دور سائنسی ترقی کا دور ہے جو زبانیں اس کے مطابق اور ان ترقیوں کے لیے ذخیرہ الفاظ اور اپنا دامن وسیع کریں گی وہی اس کا ساتھ دینے کی ضامن ہیں۔ دوسرا اہم نکتہ کسی بھی زبان کو بول چال کی زبان بناتا ہے کیوں کہ بولنے سے دوسری زبانوں کے بولنے والوں لوگوں کے میل جول سے بھی نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے ہیں یوں زبان باہمی رابطہ ہی نہیں بلکہ باہمی تعلقات کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔(۳) زبان کے ہتھیار سے آپ دوسرے دلوں کو فتح کر سکتے ہیں کیوں کہ ملک فتح کرنے سے دلوں کو فتح کرنا زیادہ اہم ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش نے کیا خوب کہا ہے:

ابھی سیفِ زباں سے لوں میں کار ذوالفقار آتش
کوئی کافر ہو گر منکر میری معجز بیانی کا

باہمی رابطے کی زبان کی اہمیت کے لیے اُردو کو دوسری زبانوں کے مقابل لانا ضروری ہے۔ اس کے لیے چند تجاویز

میرے نزدیک اہم ہیں:

ا۔اس کے لیے نئے الفاظ شامل کرنا اور پرانے متروک الفاظ کو خارج کرنا بھی ضروری ہے کیوں کہ زبان جوہڑ نہیں سمندر ہے جس میں تازہ تازہ پانی گرتا رہے، شامل ہوتا رہے تو یہ بدبودار نہیں ہوتی، تازہ اور زندہ رہتی ہے۔قدیم اُردو میں لفظ ''سوں'' مستعمل تھا مگر آج نہیں۔ولی دکنی کی غزل کا یہ شعر دیکھیں:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

یہ شعر تو سب جانتے ہیں مگر لکھتا کون ہے۔آج لفظ ''سوں'' کی جگہ ''سے'' مستعمل ہے:

۲۔ہمیں اُردو کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہے۔آج کی دنیا مریخ پر قدم رکھنے کو تیار ہے۔کیا ان بدلتے تقاضوں کے ساتھ ہم اپنی زبان وادب میں لچک پیدا کرنے کو تیار ہیں۔یہاں ایک چھوٹی سی مثال وضاحت کے لیے پیش ہے۔ درجہ حرارت معلوم کرنے کے آلہ کو انگریزی میں تھرمامیٹر کہا جاتا ہے۔اُردو میں اس کے لیے لفظ ''مقیاس الحرارت'' استعمال ہوتا ہے۔مقیاس الحرارت کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔اُردو دان تو اس کو سمجھتے ہیں باقی ان پڑھ لوگ بھی تھرمامیٹر کا لفظ عام استعمال کرتے ہیں تو اُردو زبان کی لغت میں بھی اس کو تھرمامیٹر ہی کیوں نہ لکھا اور پڑھا جائے اور اس کو اُردو کا ہی لفظ کیوں نہ قرار دیا جائے۔(۴) انگریزی میں بھی آپ کو عربی کے بہت سے الفاظ عام نظر آتے ہیں جن کو انگریزی کا پہناوا اس طرح دیا گیا ہے کہ اب وہ انگریزی الفاظ ہی ہیں مثال کے لیے دو الفاظ کا استعمال ہے۔

i۔بُرج۔عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے بلندی، اونچائی۔مثال ''بُرج العرب''۔اب انگریزی لفظ Bridge۔برج کو دیکھیں۔اُونچا، پُل کے لیے یہی لفظ مستعمل ہے۔

ii۔طور۔بلندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔کوہ طور۔بلند پہاڑ۔انگریزی میں یہی لفظ تھوڑے ردّو بدل سے Tower کا جامہ پہن کر مستعمل ہے۔

انگریز چوں کہ لمبے عرصہ تک برصغیر پر حکمران رہے ہیں اُن کی زبان اور اُن کی بول چال کے الفاظ کا شامل ہونا ایک فطری امر تھا مگر بیسویں صدی میں یورپین اقوام کی ہوش رُبا سائنسی ترقی اور سائنسی اصطلاحات کا انگریزی میں آنا اور دوسری اقوام تک پہنچنا اور جوں کا توں استعمال ہونا انگریزی الفاظ کے دوسری زبانوں میں استعمال ہونے کی بڑی وجہ ہے۔لہٰذا اُردو میں بھی ان اصطلاحات کو نہ صرف شامل ہونا بلکہ زبان کا حصہ بن جانا عجب نہیں۔لفظ ''پنسلین'' اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ان پڑھ اور جاہل طبقہ بھی ''پنسلین کا ٹیکہ'' کہتا اور سمجھتا ہے۔

یہ بات کہنے میں بہت سادہ مگر سمجھنے میں دشوار ہے کہ جو لفظ لکھا جا سکتا ہے اُسے لوگ عام طور پر پڑھتے ہیں مگر بولنے میں وہ لفظ ویسا ہی نہیں ہوتا۔کیوں کہ عام بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں فرق ہے اور یہ فرق دنیا کی ہر زبان میں ہے۔ عوامی لہجہ اور بول چال ادبی لہجہ سے مختلف ہے۔مثلاً ہم جو اُردو کلاس میں بولتے یا پڑھاتے ہوئے بولتے ہیں۔عام بول چال میں ہم اُس کی پیروی نہیں کرتے۔مگر زبان اور ادب کا گہرا تعلق ہے کیوں کہ ادب عام زبان، عام بول چال کے لوگوں کے ہی احساسات کو مخصوص ڈھانچے میں ڈھالنے کا نام ہے اور یہ لوگوں کے احساسات وجذبات کی ہی ترجمانی کرتا ہے۔جو زبان آپ

کے ذہن میں رچی بسی ہے اُس کی ترجمانی سے آپ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو لکھنے پڑھنے والا طبقہ بھی سامنے آئے۔ اُس کے لیے اُردو سکھانے اور سکھانے کے طریقے کو دلچسپ اور آسان بنانے کی ضرورت ہے کیوں کہ زبان تو ابتدائی تعلیم اور تربیت میں ہی پروان چڑھتی ہے۔ آپ کا لہجہ، بول چال کا انداز اوائل عمری میں ترتیب پاتا ہے۔ آج ہم اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں اگر اُردو دان طبقہ اپنے بچوں کو اُردو نہیں سکھا سکتا تو دوسروں سے اُس کی توقع عبث ہے۔ اس کے پیچھے چھپے عوامل بقول ناصر عباس نیئر:

> ''عالمگیریت اور اُس کے جملہ مظاہر کی عالمی زبان انگریزی ہے۔ انگریزی کو یہ حیثیت برطانوی نوآبادیات کے تحت ملی ہے۔ اس سے پہلے بھی کچھ زبانیں عالمی کردار کی حامل رہی ہیں جیسے یونانی، لاطینی، عربی وغیرہ۔ اُنھیں بھی یہ حیثیت اس لیے ملی کہ ان زبانوں کے بولنے والی قوموں نے اپنی سلطنت کی حدود دوسرے ملکوں تک وسیع کیں۔۔۔ برصغیر میں انگریزی کا کردار قاتل زبان کا نہیں رہا مگر لسانی استعماریت کا ضرور رہا ہے۔ ایک زبان کی طاقت و برتری دوسری زبانوں کی زبوں حالی کی قیمت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہاں انگریزی علم اور اقتدار کی زبان اور سماجی مرتبے کی علامت بنی ہے۔'' (۵)

اُردو زبان سکھانے کے لیے ٹھوس کام کی ضرورت ہے کیوں کہ پڑھا لکھا عام طبقہ اُردو کو مشکل جانتا ہے۔ بطور لازمی مضمون تو طالب علم اس کو او لیول (O-level) یا بارھویں جماعت تک پڑھ لکھ لیتے ہیں مگر اُس کے بعد وہ کبھی کسی اُردو کتاب کے قریب نہیں پھٹکتے۔ یہ صورتِ حال توجہ کی متقاضی ہے۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ اگر بچہ کسی زبان کو سیکھ جاتا ہے تو وہ اُس میں دلچسپی لیتا ہے اُس کی تحریر کو پڑھنے کی کوشش بھی کرتا ہے کیوں کہ اُستاد کا کام بچے کو پڑھانا نہیں پڑھنا سکھانا ہے۔ بچے کو پڑھنا سکھا دیں اُس کے ہاتھ میں اوزار دیں وہ خود علم کی عمارت تعلیم کرے گا۔ جبکہ دوسری صورتِ حال بہت تکلیف دہ ہے کہ بچے کو حروفِ تہجی کی شناخت ہی نہیں اور آپ نے اُس کو رٹا دیا، یاد کروا دیا۔ جب وہ کسی کتاب سے ہٹ کر کوئی چیز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو جگہ جگہ اُسے رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ لفظ جوڑ کر نیا لفظ نہیں پڑھ سکتا۔ بار بار کی رکاوٹ سے انسانی ذہن اُس چیز کو مشکل سمجھتا ہے اور جب مشکل ہو جائے تو اُسے عبور کرنا معصوم بچے کے بس کا روگ نہیں۔ اور پھر اُستاد بجائے شفقت اور محبت سے پیش آنے کے صورتِ حال کو سمجھنے کے، مار پیٹ کا طریقہ اپنا کر بچے کو اتنا بددل کر دیتا ہے کہ اُس کے دل میں سکول سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور نتیجتاً وہ پڑھائی چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارے یہاں سکول میں (ڈراپ آؤٹ ریشو) سکول چھوڑنے کی شرح) بہت زیادہ ہے اور معذرت کے ساتھ اس میں سب سے بڑا ہاتھ لائق فائق اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر ناتجربہ کار اور نااہل پرائمری اساتذہ کا ہے۔ حروفِ تہجی سکھانے کے لیے اُستاد کا ماسٹر یا ایم فل ہونا ضروری نہیں۔ اس کام کو میٹرک پاس محنتی اور لگن والے اساتذہ جن کو بچوں کو تعلیم دینا سکھایا گیا ہو وہ بچے کی نفسیات سے آگاہ ہوں اور بچے کو پڑھنا سکھا دیں وہ سیدھی سڑک پر چلنے والی تیز رفتار گاڑی کی طرح دوڑتے ہوئے رفتار پکڑ لے گا اور کبھی مشکل کا شکار نہ ہوگا مگر اس کے لیے اب جدید انداز اختیار کرنا ہوں گے۔ زبانوں کی یلغار اور انگریزی کے استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ٹھوس اقدام کرنے ہوں گے۔ یہ وقت کاغذی کارروائی کا نہیں قلمی جہاد کا ہے کہ ہمیں اپنی شناخت کو برقرار رکھنا ہے اور زبان ہماری شناخت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ جب ہمیں زبان آ

جائے گی تو زبان میں اظہار کی قوت بھی آ جائے گی اور قوتِ اظہار کا سلیقہ زبان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد ارشد اویسی، ڈاکٹر، مضمون: قومی یک جہتی کے لیے اُردو ناگزیر ہے، مشمولہ: العلم، شمارہ:۴، لاہور: لاہور گیریژن یونیورسٹی، ۱۸۔۲۰۱۷ء، ص:۶۷

۲۔ ایضاً، ص:۶۸

۳۔ عطاء الرحمٰن میو، ڈاکٹر، مضمون: اکابرین تحریکِ پاکستان کا ایک قرض، مشمولہ: نورِ تحقیق، تحقیقی و تنقیدی مجلّہ، جلد:۲، شمارہ:۷، ۲۰۱۸ء، ص:۱۰۵

۴۔ ایضاً، ص:۱۰۷

۵۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، عالمگیریت اور اُردو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۱۶

☆.....☆.....☆